لغات و اعرابِ قرآن

(۱۲)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرۃ (۷)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورت کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم ــــ وھکذا۔

۲ : ۷ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۵

۲ : ۷ : ۱ اللغۃ :

۲ : ۷ : ۱ (۱) [وَ] "وَ" کے مختلف معانی اور استعمالات پر الفاتحہ: ۴ میں بات ہو چکی ہے۔ دیکھئے ۱ : ۴ : ۱ (۳) ــــ وہاں واو کی چار قسموں اور ان کے اردو ترجمہ پر بات ہوئی تھی یعنی واو العطف، واو القسم، واو الحال اور

© rasailojaraid.com

واؤ المعیت - اب یہاں " واو " کی ایک نئی قسم یا نئے استعمال کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ لغوی اسے واو الاستیناف کہتے ہیں جس کا مطلب ہے نئی عبارت یا نیا مضمون شروع کرنے والی " وَ " ۔ اردو میں واو العطف (واو عاطفہ) اور واو الاستیناف (یا واو مستأنفہ) ۔ دونوں ۔ کا ترجمہ " اور " سے ہی کرنا پڑتا ہے مگر مفہوم کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے ۔ واو العطف دو چیزوں (معطوف اور معطوف علیہ) کو ایک ہی حکم (بلحاظ مضمون) میں جمع کرتی ہے مگر واو الاستیناف دو مضمونوں کو علیحدہ کرتی ہے اور اس سے ایک الگ جملے کی ابتدا ہوتی ہے ۔ (اور استیناف کے معنی ہی "نئے سرے سے بات شروع کرنا" ہی ہوتے ہیں) ۔۔۔ اس کی مثال یہی لیجئے ۔ اگر ہم یہاں سابقہ آیت کے آخری الفاظ اور زیر مطالعہ آیت کے ابتدائی الفاظ کو ساتھ ساتھ لکھیں اور درمیانی واو کو عاطفہ سمجھ لیں تو " لهم عذاب عظیم ومن الناس من ...... " کا ترجمہ ہو جائے گا " ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا اور لوگوں میں سے وہ بھی جو .... " ۔۔۔ اس ترجمہ کا کوئی تک نہیں بنتا ۔۔ لہٰذا ہم یہاں " وَ " کو مستأنفہ قرار دے کر یہاں سے ایک نئے مضمون کی ابتدا کریں گے ۔۔۔ دراصل ایسے موقع پر " وَ " کا اصل مفہوم " اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ .... " کی قسم کا ہوتا ہے مگر عام اردو محاورے میں نیا جملہ بھی " اور " سے شروع کرنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے ۔

۱ : ۷ : ۱ (۲) [مِنَ] یہ دراصل " مِنْ " ہی ہے جسے آگے " النّاس " کے " نون " ساتھ ملانے کے لیے (کیونکہ " النّاس " کا ابتدائی " الف " تو ھمزۃ الوصل ہے اور " ل " اس وجہ سے خاموش ہوگا کہ اس کے بعد " ن " حرف شمسی ہے) مِنْ کے ساکن " ن " کو حرکت دی گئی ہے ۔ کسی حرف ساکن کو آگے ملانے کے لیے عموماً کسرہ (ـِ) کی حرکت دی جاتی ہے تاہم کبھی فتحہ (ـَ) یا ضمہ (ـُ) سے بھی ملا دیتے ہیں ۔ دراصل یہ عربوں کے تلفظ کے طریقے پر منحصر ہے ۔ یہاں یہ فرق قابلِ ذکر ہے کہ " مَنْ " موصولہ یا استفہامیہ (بمعنی جو کہ یا کون ؟) کو آگے ملانا پڑے تو نون کو کسرہ

(ـَـ) دیتے ہیں مگر " مِنْ " (بمعنی میں سے) کو آگے ملانا ہو تو اس کے "نون" کو ہمیشہ فتحہ (ـَـ) کے ساتھ ملاتے ہیں ۔ قرآن کریم میں تو خیر حرکات لگی ہوئی ہوتی ہیں ۔ بغیر حرکات کی عبارت کے درست تلفظ کے لیے اس قسم کے قواعد (مثلاً مَنْ اور مِنْ کو آگے ملانے کا فرق) ہی قاری (اور عربی دان قاری) کو مدد دیتے ہیں ۔

● " مِنْ " مشہور حرف الجرّ ہے ۔ موقع استعمال کے لحاظ سے اس میں جو مختلف معنی پیدا ہوتے ہیں ان پر ہم البقرہ : ۲ میں بات کر چکے ہیں ۔ [دیکھئے ۲ : ۲ : ۱ (۵) میں] ــــ زیر مطالعہ آیت میں " مِن " تبعیض کا ہے یعنی یہاں اس کا ترجمہ "...... میں سے (بعض)" کے ساتھ ہوگا ۔

۲ : ۷ : ۱ (۳) [النَّاسِ] اس لفظ (الناس) کے مادہ اور وزن کے بارے میں اہل لغت نے متعدد اقوال بیان کئے ہیں جن کی تفصیل یوں ہے :

ا ۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس کا مادہ " ن و س " اور وزن اصلی ــ لام تعریف نکال کر ــــ " فَعَلٌ " ہے یعنی اس کی اصل شکل " نَوَسٌ " تھی جس کی "و" متحرکہ ماقبل کے مفتوح ہونے کی وجہ سے " الف " میں بدل گئی اور اس طرح لفظ " ناسٌ " بنا جو معرف باللام ہو کر " الناس " ہو گیا ہے ۔ یہ لفظ اکثر معرف باللّام ہی استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ تقریباً دو سو چالیس (۲۴۰) جگہ آیا ہے اور ہر جگہ معرف باللام (الناس) ہی آیا ہے ۔ کبھی کبھار یہ لفظ بصورت نکرہ " ناسٌ " بھی استعمال ہوتا ہے ۔ تاہم یہ بصورت نکرہ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا البتّہ عربی اشعار وغیرہ میں آیا ہے ۔ اس مادہ (ن و س) سے فعل ثلاثی مجرد ناس ینوس نوسًا (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی " ہلنا " (حرکت کرنا) اور " ہانکنا " ہوتے ہیں ۔ تاہم یہ فعل بھی قرآن کریم میں کہیں استعمال نہیں ہوا ۔ معاجم (ڈکشنریوں) میں عموماً یہ لفظ (الناس) اسی مادہ (نوس) کے تحت ہی بیان کیا جاتا ہے ۔ یہ لفظ (ناسٌ) "قوم" اور "رھط" کی طرح اسم جمع کا لفظ سمجھا جاتا ہے ۔

© rasailojaraid.com

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس (الناس) کا مادہ "ا ن س" ہے جس سے فعل ثلاثی مجرد " اَنَسَ یأنِسُ اَنساً (باب ضرب سے) اور اَنِسَ یأنَسُ اَنَسًا (باب سمع سے) اور کبھی اَنُسَ یأنُسُ اُنساً (باب کرم سے) آتا ہے۔ اور تینوں میں اس کے معنی "مانوس ہونا"، "ساتھ رہ کر خوش ہونا" ہوتے ہیں۔ یہ فعل بھی بصورت مجرد تو قرآن کریم میں مستعمل نہیں ہوا۔ البتہ اس کے مزید فیہ کے ایک آدھ باب سے کچھ صیغے آئے ہیں۔ جن کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ اس مادہ (انس) سے ہی لفظ "اِنسان" اور "اِنسِیٌّ" واحد کے لیے اور "اِنسٌ" جمع کے لیے (عموماً پوری جنس بشریت کے لئے) استعمال ہوتے ہیں۔ پھر "انسان" اور "اِنسِیٌّ" دونوں کی جمع تو "اَنَاسِیُّ" (غیر منصرف) آتی ہے۔ اور صرف کلمہ "اِنسٌ" کی جمع (اگرچہ وہ خود بھی بمعنی جمع ہی استعمال ہوتا ہے) "اُنَاسٌ" (بروزن فُعَالٌ) آتی ہے۔ یہ تمام الفاظ (انسان۔ اِنسِیّ۔ اِنسٌ اور اُنَاسٌ) قرآنِ کریم میں وارد ہوئے ہیں اور ہر ایک کا بیان اپنی جگہ آئے گا۔

● اسی طرح جو اہلِ علم لفظ "الناس" کا مادہ "ا ن س" بتاتے ہیں ان کے نزدیک اس کی اصل۔ ناس کی معرف باللام شکل "الاُناس" ہے جو کثرتِ استعمال سے "الناس" ہوگیا۔ جیسے بقول بعض "الاِلٰهُ" سے "اللہ" بن گیا (دیکھئے ۱:۱:۱ (۲) بسم اللہ کی بحث میں)۔ اس صورت میں یہ (الناس) اسم جمع نہیں بلکہ معرف باللام صیغۂ جمع ہی ہے۔ "الناس" کے برعکس لفظ "اناسٌ" اکثر نکرہ ہی استعمال ہوتا ہے۔ کبھی کبھار عربی اشعار میں یہ معرف باللام (الاناس) بھی استعمال ہوا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں یہ لفظ ہمیشہ بصورت نکرہ (اناسٌ) ہی استعمال ہوا ہے۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ "الناس" کا مادہ "ن ی س" ہے اور اس کا وزن اصلی "فَعِلٌ" یا "فَعَلٌ" ہے۔ یعنی اصل شکل "نَیِسٌ" یا "نَیَسٌ" تھی جو "واو" یا "یاء" کے الف میں بدلنے کے مشہور

صرفی قاعدہ (واو یا یاء متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدل جاتی ہے) کے ماتحت "ناس" ہوگیا اور یہ بھی اسم جمع ہی ہے۔ اور اس قول کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ بعض قراءات (مثلاً الدوری عن کسائی کے ہاں) یہ لفظ (الناس) امالہ کے ساتھ "النیس" (بروزن "دیس") پڑھا جاتا ہے۔ تاہم اس مادہ "ن ی س" سے کوئی فعل۔ مجرد یا مزید فیہ ــــ عربی زبان میں استعمال نہیں ہوتا۔ اور امالہ کرنے والے بھی اسے ہر جگہ امالہ کے ساتھ نہیں پڑھتے۔ گویا بات مادہ کی نہیں بلکہ روایتِ قراءت کی پابندی کی ہی ہے۔

۴۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اس (الناس) کا مادہ "ن س ی" ہے جس سے فعل ثلاثی مجرد "نسِی ..... ینسٰی نسیانًا (سمع سے) زیادہ تر بمعنی "بھول جانا یا بھلا دینا" قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ اس صورت میں لفظ "الناس" کی اصلی شکل "النَسْیُ" یا "النَسَیَ" تھی۔ یعنی اس کا وزنِ اصلی فَعْلٌ یا فَعَلٌ تھا۔ پھر لام کلمہ کو عین کلمہ کی جگہ کر دیا گیا ــــ [اور کثرت استعمال کی بناء پر الفاظ میں اس طرح کے 'قلب' یعنی الٹ پلٹ کی مثالیں عربی زبان میں بکثرت ملتی ہیں۔ جیسے پنجابی میں "چاقو" کو "قاچو" کہہ دیتے ہیں] اور یوں یہ لفظ "النَیَس" ہو کر پھر "الناس" بن گیا۔ اور اُس کا وزن الٹ کر "فَلَعٌ" رہ گیا ہے۔ اور اس لفظ کی یہ اصل بھی امالہ کی ایک وجہ ہو سکتی ہے ــــ اور بقول بعض اس لفظ (الناس) کی اسی مادے (ن س ی) سے اصل شکل "اِنْسِیان" بروزن "اِفْعِلان" ہے جس میں تبدیلی ہو کر "انسان" بنا۔ ــــ پھر اس کی جمع "اَنَاس" معرف باللام ہو کر "الناس" بن گئی۔

● اور اس مادے (نسی) کے بارے میں علمی دلیل سے زیادہ ایک شاعرانہ توجیہ یہ بھی ہے کہ فعل "نسِیَ" سے اسم الفاعل "ناسٍ" (بھول جانے والا) بنتا ہے اور چونکہ ابوالبشر آدم علیہ السلام کے فرمان الٰہی کو بھول جانے کا ذکر قرآن کریم (طٰہٰ : ۱۱۵) میں آیا ہے۔ اسی سے تلمیحًا یہ کہا جاتا ہے کہ "اوّل الناس اَوّلُ ناسٍ" (پہلا انسان پہلا بھول جانے والا تھا) ــــــــ

© rasailojaraid.com

ــــ، بہرحال مادہ جو بھی ہو لفظ " الناس " یا تو اسم جمع ہے یا صیغۂ جمع ہے۔ اور اس کا موزوں اردو ترجمہ " لوگ " ہے جو اردو میں بھی اسم جمع ہے۔ (لوگ آئے)۔ اگرچہ بعض افعال کے ساتھ (اردو میں) اس کی جمع " لوگوں " بھی مستعمل ہے۔

۲ : ۷ : ۱ (۴) [مَنْ] یہ ایک مبنی (بر سکون) اسم ہے (یعنی اس کا آخری " ن " ہمیشہ ساکن ہی ہوتا ہے سوائے اس کے کہ کبھی آگے ملانے کے لیے اس کو کسرہ (ـِــ) دی جاتی ہے) ــــ اس کے معانی اور مواقعِ استعمال بھی متعدد ہیں جن کی تفصیل یوں ہے :

۱۔ کبھی یہ " مَنْ " استفہامیہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ " کون ؟ " سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ عربی زبان میں یہ (مَنْ) واحد تثنیہ جمع مذکر مؤنث سب کے لیے آتا ہے (انگریزی ؟ Who کی طرح)۔ اگرچہ اردو میں حسب موقع اس کے لیے مختلف الفاظ مثلاً " کون " یا " کس " استعمال ہوتے ہیں۔ اور کبھی عبارت میں زور پیدا کرنے کے لیے " مَنْ " کے ساتھ " ذا " لگا دیتے ہیں یعنی " مَنْ ذا " ؟ ــــ یہ " ذا " دراصل " ھذا " کی مخفف (بلکہ اصلی) شکل ہے [دیکھئے ۲ : ۱ : ۱ (۱)] اور اس کی اردو میں مثال ایسی ہے جیسے کہیں " یہ کام کس نے کیا ؟ " اور زور دینے کے لیے کہیں " کون ہے جس نے یہ کام کیا ؟ " ــــ اور کبھی " مَن ! " یا " مَن ذا ؟ " کے بعد آنے والے فقرے کے بعد " اِلَّا " لگا کر ایک اور فقرہ لاتے ہیں جس سے اس میں استفہام انکاری یعنی نفی کے معنی پیدا ہوتے ہیں اس وقت " مَنْ " یا " مَنْ ذا " کا اردو ترجمہ " کون " یا " وہ کون ہے جو " کے ساتھ کرنے کی بجائے " کوئی نہیں جو " کے ساتھ کرنا زیادہ موزوں لگتا ہے جیسے " مَن یغفرُ الذنوبَ اِلَّا اللّٰہُ " (آل عمران : ۱۳۵) اور " مَنْ ذا الذی یشفع عندہ اِلَّا باِذنہ " (البقرہ : ۲۵۵) میں آیا ہے۔ " مَنْ " کے

اس قسم کے استعمالات پر اپنی اپنی جگہ وضاحت ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ۔
۲۔ کبھی "مَنْ" موصولہ ہوتا ہے جو "الذی" کے معنی میں آتا ہے البتہ لفظی فرق یہ ہے کہ "مَنْ" واحد تثنیہ جمع مذکر مؤنث سب کے لیے استعمال ہوتا (اتفاق سے اس استعمال (موصول ہونے) کے لحاظ سے بھی "مَنْ" انگریزی کے "Who" کی مانند ہی ہے)۔ اور مبنی ہونے کے باعث یہ تینوں حالتوں یعنی رفع نصب جر ــــ میں یکساں رہتا ہے جب کہ "الذی" کی مختلف صورتیں ہیں [دیکھئے ۱:۲:۱(۱)] نیز یہ (مَنْ) زیادہ تر عاقل اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس (مَن موصولہ) کا عام اردو ترجمہ تو "جو" ہے۔ تاہم عدد، جنس اور بعض افعال کی مناسبت سے حسب موقع اس کا ترجمہ "جو کہ"، "جس نے (کہ)"، "جس کو"، "جس کا"، "جنہوں نے"، "جن (سے/کا/کو)" کے ساتھ کر لیا جاتا ہے۔ اس میں عموماً معرفہ کے معنی ہوتے ہیں یعنی اس کا ترجمہ "وہ جو" یعنی "وہ (خاص) آدمی یا لوگ جو" ہونا چاہیے تاہم کبھی کبھی یہ (مَن موصولہ) نکرہ موصوفہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا اردو ترجمہ "کوئی ایسا جو"، یا "بعض ایسے جو" سے کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔
۳ "مَن" کا ایک استعمال "شرطیہ" کا ہے یہ (مَن شرطیہ) اپنے بعد آنے والے فعل (مضارع) اور شرط کے جواب میں آنے والے فعل (مضارع) (دونوں) کو جزم دیتا ہے جیسے "مَن یَعمَلْ سُوْءًا یُجْزَ بِہٖ" (النسا:۱۲۳) میں اس وقت اس کا اردو ترجمہ "جو کوئی بھی"، "جس کسی نے بھی" وغیرہ کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اور چونکہ شرط میں ہمیشہ مستقبل کا مفہوم ہوتا ہے (شرط ماضی کے بارے میں تو ہو ہی نہیں سکتی) اس لیے اگر "مَنْ" شرطیہ کے ساتھ فعل ماضی بھی آئے (جیسے "مَنْ عَمِلَ صَالِحًا..." (المؤمن:۴۰) میں) تو بھی اس کا اردو ترجمہ فعل مستقبل کے ساتھ ہی کیا جانا چاہیے۔
"مَنْ" کی ان تین معروف اقسام (استفہامیہ، موصولہ اور شرطیہ)

© rasailojaraid.com

اور ان کے مواقع استعمال کو ذہن میں رکھئے۔ آگے چل کر یہ چیز کسی عبارت کے اعراب اور معنی سمجھنے میں مدد دے گی۔

۲ : ۷ : ۱ (۵) [يَقُوْلُ] کا مادہ "ق و ل" اور وزن اصلی "يَفْعُلُ" ہے یعنی اس کی شکل اصلی "يَقْوُلُ" تھی جس میں عربوں کے تلفظ ـــ یا صرفی قاعدہ ـــ کے مطابق "و" کی حرکت (ـُـ) ماقبل ساکن (ق) کو دے کر خود "واو" کو اس حرکت کے موافق حرف میں بدل دیتے ہیں۔ جو موجودہ صورت میں "واو" ہی رہتی ہے۔ اس طرح يَقْوُل ـــ يقُول میں بدل جاتا ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "قال يقول قولاً۔ دراصل قوَل يَقْوُل قولاً ـ (باب نصر سے) آتا ہے جس کا عام مصدری اردو ترجمہ "کہنا" ہے۔ تاہم سیاق و سباق اور مضمون کی مناسبت سے بعض دفعہ اس کا ترجمہ "فرمانا" اور کبھی "عرض کرنا" یا کسی اور مناسب فعل سے بھی کر لیا جاتا ہے۔ یہاں "يقولُ" فعل مضارع کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے جس کا ترجمہ "کہتا ہے" ہوگا۔ اس فعل (قالَ) کے مفعول (یعنی کیا کہا؟) کے لیے عموماً تو کوئی جملہ ہی آتا ہے لیکن اگر جملے کی بجائے کوئی "اسم" آجائے تو وہ مفعول بنفسہ (بغیر صلہ کے) آتا ہے (لہٰذا منصوب ہوتا ہے)۔ جیسے "واللّٰهُ يقول الحَقَّ" (الاحزاب: ۴) اور "قالوا سلامًا" (ھود: ۶۹) میں اور جس "سے" بات کی جائے (یعنی مخاطب) تو اردو کے اس "سے" (کہا) کے لیے عربی میں فعل "قال" کے بعد لام الجر (لِ) بطور صلہ کے آتا ہے جیسے "قالَ موسٰی لِقومِه (الاعراف: ۱۲۸) میں۔ خیال رہے "قالهُ" کا مطلب ہے "اس نے وہ (بات) کہی" اور "قال لهُ" کے معنی ہیں "اس نے اس سے کہا"۔ ایسے موقع پر اردو کے "سے" کا ترجمہ عربی میں "مِنْ" سے کرنا شدید غلطی ہوگی اور مخاطب کو مفعول بنفسہ سمجھ لینا بھی ویسی ہی غلطی ہے۔

اس فعل ثلاثی مجرد (قال يقول) کے مختلف صیغے، مصدر اور بعض

.com

مشتقات قرآن کریم میں نہایت کثرت سے وارد ہوئے ہیں اور مزید فیہ کے ایک
باب (تفعّل) سے بھی ایک دو صیغے آئے ہیں۔

۲:۷:۱ (۶) [اٰمنّا باللّٰہ] جو " آمَنَّا " (جس پر ابھی بات ہوگی)
+ بِ (بمعنی "پر") + اللّٰہ کا مرکب ہے۔ اس میں کلمہ "آمَنَّا" کا مادہ
" ا م ن " اور وزن اصلی " اَفْعَلْنَا " ہے اور اس کی شکل اصلی "ءَاْ مَنْنَا"
تھی۔ جس میں " اجتماعِ ھمزتین " کے باعث " ءَاْ " بدل کر " ءَا " یا " آ "
یا " ا " ہوگیا (اس کے ہم پر آگے بات ہوگی)۔ اور دو " نون " بھی مدغم
ہوکر " نّا " کی صورت اختیار کرگئے اور یوں یہ لفظ " آمَنَّا " بنا ــــ اس
مادہ (امن) سے فعل ثلاثی مجرد کے معانی اور استعمال ــــ بلکہ اس کے باب افعال
(آمن یُؤمن ایماناً) کے معنی پر اور اس کے صلہ " بِ " کے استعمال پر
بھی البقرہ : ۲ میں بات ہو چکی ہے [دیکھئے ۲:۲:۱ (۱)] " آمنّا "
اسی باب افعال سے صیغہ جمع متکلم (فعل ماضی) ہے اور اس کے ساتھ " بِاللّٰہ "
لگنے سے اس (آمنّا باللّٰہ) کا لفظی ترجمہ تو ہوگا " ہم ایمان لائے اللہ پر "
جسے سلیس اردو میں " ہم اللہ پر ایمان لائے " کی شکل دی جاسکتی ہے۔ جب کہ
بعض مترجمین نے اردو محاورے کو مدنظر رکھتے ہوئے " ہم ایمان رکھتے ہیں "
سے بھی ترجمہ کیا ہے جو مفہوم کے لحاظ سے درست سہی مگر وہ " آمنّا " سے
زیادہ " نؤمن " کا ترجمہ لگتا ہے۔

۲:۷:۱ (۷) [وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ] اس میں ابتدائی " وَ " تو
عاطفہ (بمعنی " اور ") ہے اور " باء (بِ) فعل " آمَنَّا " کا صلہ
مکرر (برائے تاکید) آیا ہے۔ اس کی وجہ سے اردو ترجمہ میں " پر بھی " کا
اضافہ ہوگا ــــ یعنی " الیوم الآخر " پر بھی (ایمان لائے) "۔ کلمہ " اَلْیَوْمُ "
جو یہاں معرف باللام ہے کے مادہ، وزن وغیرہ پر الفاتحہ : ۳ کے ضمن
میں ۱:۳:۱ (۲) میں بات ہو چکی ہے۔ یہاں بھی اس کا ترجمہ " یوم الدین "

© rasailojaraid.com

کی طرح " دن " سے کرنا ہی زیادہ موزوں ہے اور اکثر مترجمین نے یہی کیا ہے۔
دوسرے کلمہ (" الآخِر ") کے مادہ ، وزن ، اشتقاق اور معنی کی بحث اس سے پہلے البقرہ : ۴ کے کلمہ " آخرۃ " کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ دیکھئے ۲:۳:۱(۵)۔ لفظ " آخِر " مذکر اور " آخِرۃ " مؤنث ہے (اردو میں یہی لفظ بصورت " آخرت " ۔ لمبی " ت " کے ساتھ لکھا جاتا ہے) ۔ اس طرح اس مرکب توصیفی (الیوم الآخر) کا لفظی ترجمہ تو " سب سے آخر پر آنے والا دن " ہونا چاہیئے مگر اصطلاحی معنوں (جس پر لفظ " آخرۃ " میں بات ہو چکی ہے) اور اردو محاورے کو سامنے رکھتے ہوئے بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ " روزِ آخرت " کیا ہے۔[1]
بعض نے لفظی ترجمہ سے قریب رہنے کے لیے اس کا ترجمہ " پچھلا دن " کیا ہے۔ بعض نے " آخری دن " کو اختیار کیا ہے۔ جب کہ بعض بزرگوں نے مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے " قیامت کا دن " ترجمہ کیا ہے جو بظاہر لفظی ترجمہ سے زیادہ دور ہے۔ اگرچہ مفہوم درست ہے۔

۲:۷:۱(۸) [وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ] یہ ایک پورا جملہ ہے جس کے کلمات کی الگ الگ تفصیل یوں ہے:۔

● " وَ " یہاں عاطفہ بمعنی " اور " بھی ہو سکتی ہے تاہم یہاں اسے حالیہ (واو الحال) سمجھنا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے اکثر مترجمین نے یہاں اس کا ترجمہ " حالانکہ " کے ساتھ کیا ہے۔ ایک آدھ نے اس کا ترجمہ " مگر " سے بھی کیا ہے یعنی " لکن " کے معنوں میں لیا ہے اور یہ محاورے کے لحاظ سے ہی درست ہے۔

● اگلا کلمہ " ما " یہاں مشابہ " بلیس " یعنی " الحجازیہ " ہے اور جملے میں نفی کے معنی کے لیے اس کا ترجمہ " نہیں " (ہیں / ہے) ہوگا۔ اس کے بعد " هُمْ "

---

[1] فارسی کا لفظ " روز " اور عربی کا " یوم " اردو کے " دن " کی طرح بعض تراکیب میں اردو میں بھی مستعمل ہیں۔ مثلاً " روزِ روشن " ۔ " یومِ افواج " وغیرہ۔

ضمیر جمع ہے جس کا اردو ترجمہ " وہ " ہے۔ جملے کے آخری حصہ " بِمُؤْمِنِیْنَ" کی ابتدائی باء (بِ) تو وہ ہے جو "ما" یا "لیس" کی خبر کے شروع میں لاتے ہیں۔ اس 'باء' کا اردو میں کوئی ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس سے عبارت میں ایک زور اور تاکید کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

● لفظ " مؤمنین " باب اِفعال۔ آمَنَ یُؤْمِنُ ایماناً سے اسم الفاعل " مؤمِنٌ " کی جمع مذکر سالم ہے یعنی " ایمان لانے والے "۔ اس کے مادہ (امن) اور معنی وغیرہ پر البقرہ : ۳ میں بات ہو چکی ہے۔ دیکھئے ۲ : ۲ : ۱ (۱)

● لفظ " مومنین " کا ترجمہ " ایمان لانے والے " یا صرف " ایمان والے " بالکل درست ہے اس لیے کہ عربی مصدر " ایمان " اردو میں اپنے اصل عربی اور اصطلاحی معنوں میں مستعمل ہے۔ یعنی یہ معلوم ہے کہ " ایمان " کن چیزوں کو ماننے کا نام ہے؟ — اور غالباً اسی لیے اکثر مترجمین نے " ماھم بمؤمنین " کا ترجمہ " نہیں وہ ایمان لانے والے " کیا ہے بعض نے نسبتاً سلیس نثر کا خیال کرتے ہوئے " وہ ایمان والے نہیں " یا " وہ مومن نہیں ہیں " سے ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے محاورے کو ملحوظ رکھتے ہوئے " ان کو یقین نہیں ہے " اور بعض نے " وہ ایمان نہیں رکھتے " سے ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے جو اس کا ترجمہ " وہ ایمان نہیں لائے " سے کیا ہے تو یہ بلاوجہ جملہ اسمیہ کا ترجمہ جملہ فعلیہ سے کر دیا ہے۔ جو اصل عبارت سے ہٹنے والی بات ہے، اگرچہ مفہوم میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی۔

● " مَا " کی خبر پر باء (بِ) داخل ہونے سے مفہوم میں جو زور اور تاکید پیدا ہوتی ہے۔ بعض مترجمین نے اس بناء پر عبارت میں " وہ مومن ہیں ہی نہیں " کا مفہوم پا کر ترجمے میں تاکید کے لیے " ہرگز " اور " بالکل " اور " بالکل ہی " (نہیں) کا اضافہ کیا ہے جو محاورے کے لحاظ سے اصل مفہوم کو بہتر ظاہر کرتا ہے۔

● اس حصۂ آیت کے مختلف ترجموں کے اس تقابلی مطالعہ سے اور اصل (لفظی) عربی معانی کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کو اس بات کا احساس ہوتا جائے گا کہ " ترجمہ

© rasailojaraid.com

کرنا" اور خصوصاً "معانی قرآن" کو ترجمہ میں لانا اور اس میں لفظ، محاورہ اور اصطلاح کے درمیان توازن اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا کس قدر مشکل اور محنت طلب کام ہے۔

۲:۷:۲ ۔ الاعراب

ومن الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وما ھم بمؤمنین

[وَ] بعض نحویوں (مثلاً عکبری) نے اسے یہاں عاطفہ قرار دے کر مابعد جملے کا عطف "الذین یومنون بالغیب ...... الآیہ (۳)" پر کیا ہے[۱] گویا وہی بیان "اقسام الناس" چل رہا ہے۔ لیکن درمیان میں جملہ مستانفہ "ان الذین کفروا...... الآیہ (۶)" کے آجانے کے بعد اسے (آیت ۸ زیر مطالعہ کو) سابقہ آیت ۳ پر معطوف کرنے کا کوئی تک نہیں بنتا۔ اس لیے جن حضرات (مثلاً الدرویش) نے اسے واو الاستیناف یعنی واو مستانفہ قرار دیا ہے[۲] ان کا موقف زیادہ بہتر ہے یعنی یہاں سے ایک نئے جملے اور بالکل نئی بات کا آغاز ہوتا ہے۔ تینوں جگہ (آیت ۳ و ۴ پھر آیت ۶ و ۷ اور اب آیت ۸ میں)، ایک الگ الگ گروہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے گروہِ مؤمنین کا، دوسری جگہ گروہِ کافرین اور تیسری جگہ گروہِ منافقین کا الگ الگ بیان ہے۔ اردو زبان میں واو عاطفہ اور واو مستانفہ دونوں کا ترجمہ "اور" ہی سے کرنا پڑتا ہے مگر مفہوم کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے (اس کی وضاحت ابھی اوپر بحث اللغۃ میں ۲:۷:۱(۱) پر ہو چکی ہے)۔ [مِنَ النَّاسِ] میں "مِن" جار اور "الناس" مجرور ہے اور یہاں "مِن" تبعیض (یعنی بعض اور کچھ کے معنی) کے لیے ہے۔ مِنْ کو آگے ملانے کے لیے "ن" پر عموماً فتحہ (ـَ) آتی ہے۔ شاذ صورتوں میں کسرہ (ـِ) بھی آتی ہے مثلاً "مِنِ ابْنِكَ" میں ۔ مگر "عَنْ" کو آگے ملانے کے لیے "ن" ہمیشہ مکسور ہوتا ہے جیسے "عَنِ النَّاسِ" میں۔

---

[۱] التبیان ج ۱ ص ۲۴ [۲] اعراب القرآن ج ۱ ص ۳۱

● [مَنْ] یہاں موصولہ (معرفہ) بمعنی " الذی " یا " الذین " بھی ہوسکتا ہے اس صورت میں اس (مَن) سے مراد ایسے خاص آدمی یا لوگ ہوں گے جو عہد رسالت میں یہ بات (جس کا آگے ذکر آرہا ہے) کہا کرتے تھے اس صورت میں " مَن " کے بعد والی عبارت اس (مَن) کا صلہ ہے ۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس " مَن " کو نکرہ موصوفہ سمجھا جائے اور یہ زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ اس میں عموم کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں یعنی " کوئی ایسا آدمی بھی جو " یا " کچھ ایسے لوگ بھی جو "۔ اس صورت میں " مَنْ " کے بعد والی عبارت اس (مَن) کی نعت یا صفت شمار ہوگی اور " (مِنَ النَّاس " ایک محذوف " مبتدا نکرہ مؤخر " کی خبر (مقدم) ہوگا ۔ تقدیرِ (UNDERSTOOD) عبارت کچھ یوں ہوگی " (مِنَ النَّاس فریقٌ یقول " ۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہیں " فی المسجد رجل "۔

● لفظ " مَن " واحد تثنیہ جمع مذکر مؤنث سب کے لیے ہوتا ہے اس لیے یہاں " مَنْ " کی لفظی صورت (جو واحد لگتی ہے) کا لحاظ رکھتے ہوئے فعل [یقول] بصیغۂ واحد غائب آیا ہے ۔ اگر یہاں " یقولون " ہوتا تو بھی (عربی زبان کے لحاظ سے) درست ہوتا ۔ خود قرآن کریم میں " مَنْ " کے ساتھ صلہ یا صفت کے طور پر آنے والے جملہ فعلیہ میں فعل واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوئے ہیں ۔ مثلاً " (منھم من یستمع الیک " (الانعام : ۲۵) اور " ومنھم من یستمعون الیک " (یونس : ۴۲) میں ۔۔۔ ان پر مفصل بات اپنے موقع پر ہوگی ۔ ان شاء اللہ ۔

● [آمنا] میں " آمنا " فعل ماضی معروف ہے جس میں ضمیر فاعلین " نحن " مستتر ہے ۔ اور یہ فعل بصیغۂ جمع یہاں " مَن " کے معنوں کے لحاظ سے آیا ہے ۔ جس طرح اوپر فعل " یقول " بصیغۂ واحد بلحاظ لفظ (مَن) آیا ہے ۔ [باللہ] میں باء (بِ) تو صلۂ فعل کے طور پر آئی ہے اس لیے یہ مرکب جاری (باللہ) یہاں محلاً منصوب ہے ۔ اور چاہیں تو اس جار مجرور (باللہ) کو متعلق فعل (آمنا)

© rasailojaraid.com

قرار دے لیں اردو ترجمہ میں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ [وَ] عاطفہ ہے اور اس کا عطف " باللّٰہ" پر ہے۔ یعنی یہ دراصل " وَ آمنّا بالیوم الاٰخرِ" ہے [بالیوم الآخر] میں "یوم" موصوف اور مجرور بالجر (بِ) ہے اور " الآخر" اس کی صفت ہے لہٰذا مجرور ہے۔ ان میں علامتِ جر آخری " م" اور " ر" کا کسرہ (ـِـ) ہے۔ اور یہ پورا مرکب توصیفی اب مرکب جاری بن کر محلاً منصوب ہے یا متعلق فعل ہے۔

● [وَما ھُم بمؤمنین] ایک مکمل جملہ اسمیہ ہے جس میں ابتدائی " وَ" حالیہ (واوالحال) ہے (اگرچہ عاطفہ ہونے کا بھی بعید احتمال ہو سکتا ہے) " ما" الحجازیہ بمعنی لَیْسَ ہے۔ " مَا" کے معنی و استعمالات پر بات پہلے ہو چکی ہے [دیکھئے ۲:۲:۱(۵)] " ھُم" ضمیر غائب مذکر اور مرفوع منفصل ہے جو یہاں " مَا" کے اسم کے طور پر آئی ہے۔ اور اس " مَا" کی خبر " بمؤمنین" ہے۔ جس پر بار جارّہ (بِ) لگی ہے۔ اس آخری حصے (جملے) کے مختلف تراجم کی اوپر " اللغۃ" میں وضاحت ہو چکی ہے۔

۲:۷:۲(۱) عربی میں مبتدا، خبر یا فاعل پر بعض حروف جارہ تاکید اور زور کا معنی پیدا کرنے کے لیے لگتے ہیں۔ ان میں سے لام مفتوحہ (لَ) عموماً تاکید ایجاب یا اثبات کے لئے (کسی بات کے ضرور ہونے کے مفہوم کے لئے) اور بار مکسورہ (بِ) عموماً تاکید نفی (کسی چیز کے نہ ہونے پر زور دینے) کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ جیسے ہم کہیں " ھذا لَزیدٌ" (یہ ضرور زید ہی ہے) یا کہیں " ما ھذا بِزیدٍ" (یہ زید تو نہیں ___ یا یہ ہرگز زید نہیں ہے)۔ نحوی عام طور پر اس " باء" کو " باء زائدہ للتوکید" یا " حرف جر زائد للتوکید" کہتے ہیں۔ یہ ایک نحوی اصطلاح ہے۔ " زائد" کے معنی " غیر ضروری" ہرگز نہیں ہوتے۔ اور ان معنوں (غیر ضروری) کے لحاظ سے قرآن کریم میں کوئی حرف یا لفظ " زائد" نہیں ہے۔ بلکہ اہل بلاغت کے نزدیک تو یہاں (آیت زیر

مطالعہ میں) تاکید کے لئے اس " بِ " کے بغیر چارہ نہیں۔ مطلق نفی تو "ماھم مؤمنین" (خبر منصوب) میں بھی ہو سکتی ہے ۔ اور اسی بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض مترجمین نے "وہ ہرگز (یا بالکل) ایمان والے نہیں" سے ترجمہ کیا ہے ۔ واو حالیہ کی وجہ سے یہاں پورا جملہ اسمیہ " وماھم بمؤمنین " حال ہو کر محلاً منصوب ہے ۔

۲:۷:۳ الرسم

ومن الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وما ھم بمؤمنین ۔

اس آیت میں تمام کلمات کا رسمِ عثمانی اور رسمِ املائی یکساں ہے ۔ البتّہ " امنا " اور " اخر " کے شروع میں ھمزۂ مفتوحہ کو مابعد الف میں ملا کر صرف ایک الف کی شکل میں " ا " لکھنا قابلِ ذکر ہے اور اس پر ۲:۲:۳ اور ۲:۳:۴ (۱) میں بات ہو چکی ہے ۔ بہرحال ان کلمات کا یہی رسم ۔ کتابت مصحف اور عام عربی تحریر میں مستعمل ہے ۔ اور محذوف ھمزہ کو ضبط کے ذریعے ظاہر کرنے کے مختلف طریقے رائج ہیں ۔

۲:۷:۴ الضبط

زیرِ مطالعہ آیت میں اختلافِ ضبط کے حسبِ ذیل پہلو قابلِ ذکر ہیں :۔

۱۔ ھمزۃ الوصل کی علامت کا استعمال یا ترک اور صورتِ علامت کا فرق ۔ یہ چیز کلمات " الناس " ۔ " باللہ " اور " بالیوم الاخر " کے ضبط میں سامنے آئے گی ۔

۲۔ ھمزۃ القطع کے لئے علامتِ قطع کا استعمال یا ترک اور علامتِ قطع کی صورت کا فرق ۔ یہ فرق کلمات " امنا " ، " الاخر " اور " بمؤمنین " کے ضبط میں ظاہر ہو گا ۔

© rasailojaraid.com

۳ ۔ واو ساکنہ ماقبل مضموم پر علامتِ سکون کا استعمال یا اس کا ترک ۔ اس کا نمونہ " یقول " کے ضبط میں دیکھیں گے ۔

۴ ۔ یائے ساکنہ ماقبل مکسور پر علامتِ سکون کا استعمال یا عدم استعمال ۔ یا اس ماقبل مکسور کے نیچے کسرہ (ـِـ) کی بجائے علامتِ اشباع (ـٖـ) کا استعمال ۔ اس اختلاف کی مثال آپ کو " بمؤمنین " کے ضبط میں ملے گی ۔

۵ ۔ الف کے ماقبل مفتوح حرف پر فتحہ (ـَـ) کی بجائے علامتِ اشباع بصورت (ـٰـ) لگانا ۔ اس کا نمونہ " امنا " ، " ما " اور " الناس " کے ضبط میں سامنے آئے گا ۔

۶ ۔ لام جلالت (اللہ میں) کے اشباع کی علامت کا فرق ۔

۷ ۔ نون ساکنہ مخفاۃ کے ادغام ناقص میں حرفِ مدغم پر علامتِ سکون اور حرفِ مدغم فیہ پر علامتِ تشدید ڈالنے یا نہ ڈالنے کا فرق ۔ یہ فرق " من یقول " کے ضبط میں واضح ہوگا ۔

۸ ۔ بعض افریقی ممالک میں نون متطرفہ کے عدم اعجام کا رواج جیسے آپ " من " اور " بمؤمنین " کی کتابت میں دیکھیں گے ۔

۹ ۔ افریقی ہی ملکوں میں " ق " کا بصورت " ف " لکھا جانا یہ فرق " یقول " کے لکھنے میں محسوس ہوگا ۔

۱۰ ۔ " لا " میں الف اور لام کے تعین کا فرق " الاخر " کے ضبط میں نمودار ہوگا ۔ اس طرح اس آیت میں اختلافِ ضبط کی مندرجہ ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں

وَمِنَ النَّاسِ ، مِنَ النّٰاسِ ، مِنَ ٱلنَّاسِ ، مِنَ
ٱلنَّاسِ ، مِنَ • النَّاسِ

مَنْ یَّقُوْلُ ۔ مَنْ یَقُوْلُ ، مَن یَقُولُ ، مَنْ یَّفُوْلُ

اٰمَنَّا ، اٰمَنّٰا ، ءَامَنَّا ، اٰمَنَّا ، ءَآمَنَّا

(باقی ص ۶۴ پر)